گلشن راز جدید

مشمولہ

"زبور عجم" از علامہ اقبالؒ

ترجمۂ منظوم

کوکب شادانی

چہرہ نما

تیری آنکھوں کے لئے میں نے نظر پیدا کی
اور ترے دل میں بھی دنیائے دگر پیدا کی
چشم انجم سے نہاں مشرق خوابیدہ میں
نغمۂ زیست سے میں نے ہی سحر پیدا کی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تمہید

کہاں مشرق میں وہ سوز کہن ہے
گئی جاں، اب تو باقی صرف تن ہے
پئے تصویر ہست و نیست کیا ہے
وہ کیا سمجھے کہ ذوق زیست کیا ہے
دلوں میں مدعا باقی نہیں ہے
کسی نے میں نوا باقی نہیں ہے
بطرز نو مرا مقصود ہے یہ
جواب نامۂ محمود ہے یہ
زمان شیخ (۱) سے تاحال اصلا
کسی نے ہم کو سوز جاں نہ بخشا
کفن پہنے ہوئے سوتے ہیں اب تک
قیامت کے لئے روتے ہیں اب تک

---

(۱) شیخ فریدالدین عطارؒ

کہاں ہے آج وہ دانائے تبریز(۱)   نظر سے جس کی گذرا دور چنگیز
ہے میرے سامنے یہ انقلاب اور   جسے کہئے طلوع آفتاب اور
رخ معنی سے جب پردہ اٹھایا   تو ہر ذرے کو میں نے مہر بخشا
مری مستی کہ بے بادہ نہیں ہے   فسانوں کی بھی دلدادہ نہیں ہے
امید خیر اس بدبخت سے کیا   مجھے الزام دے جو شاعری کا
مجھے کیا کام کوئے دلبراں سے   غم دل یا کسی جان جہاں سے
غبار رہگذر کیا ہو مری خاک   مری مٹی دل بے بس سے ہے پاک
ہے جبریل امیں جب میرا ہمکام   رقیب و قاصد و درباں سے کیا کام
فقیری میری سامان کلیمی   فر شاہنشہی میری کلیمی
جو ذرہ ہوں تو صحرا سے زیادہ   جو قطرہ ہوں تو دریا سے زیادہ
مرے شیشے سے پتھر بھی ہے لرزاں   سمندر سے مرے ساحل ہے پنہاں
مرے پردے میں تقدیریں نہاں ہیں   مری پروردہ حشر انگیزیاں ہیں
کچھ اپنی ذات کی خلوت میں ٹھہیرا   کیا انمٹ جہاں بھر میں نے پیدا
مجھے اس شاعری سے عار ہوگا؟
کہ صدیوں میں کوئی عطار(۲) ہوگا!

مری جاں رزم مرگ و زندگانی   مرا مقصد حیات جاودانی
تری مٹی میں جب یہ جاں نہ دیکھی   بدن میں تیرے اپنی جان ڈالی
جو آتش ہے مرے داغوں کا جوہر   اسی سے کر تو اپنی شب منوّر
سر تخلیق دل کا طور کچھ تھا   مری لوح جبیں میں اور کچھ تھا
مرا ذوق خودی عسل آفریں ہے   حقیقت ہے یہ افسانہ نہیں ہے
خودی کا کیف میں نے آزمایا
تو یہ جام اہل مشرق کو پلایا!

یہ وہ خط ہے جسے جبریل پڑھ کے   متاع نور سے دامن چھڑالے
مقام و مرتبت سے ہو کے نالاں   کہے اللہ سے با چشم گریاں
"نہیں ہے جلوۂ عریاں کی خواہش   مجھے ہے بس غم پنہاں کی خواہش

---

(۱) حضرت شمس تبریزیؒ
(۲) شیخ فریدالدین عطّارؒ

میں گذرا اس وصال جاوداں سے   یہ کم ہے لذت آہ و فغاں سے
نیاز و ناز النسانی عطا کر   گداز و آتش جانی عطا کر"

سوال (۱)

میں پھر فکر ہوں غرق تحیّر
وہ کیا شے ہے جسے کہئے تفکّر؟
کہیں کس فکر کو ہم شرط منزل؟
کبھی یہ حق کبھی کہلائے باطل!

جواب

چمک سی یہ دل انساں میں کیا ہے؟   نہاں ہوتے ہوئے جو بر ملا ہے!
اسی کو ثابت و سیّار پایا!   اسی کو نور پایا، نار پایا!
کبھی ہے نار با تذلیل و برہاں   کبھی ہے نور با جبریل کی جاں
وہ اس کی جاں فروزی، سینہ تابی   کہ شرمائے شعاع آفتابی!
وہ خاک آلودہ بھی ہے لامکاں بھی   رہین روز و شب بھی بے زماں بھی
کہاں وہ اور کہاں گنتی نفس کی   تلاش اس کی نہیں ایسوں کے بس کی
کبھی واماندہ اور ساحل کا خوگر   کبھی دریا بھی اس کا نیم ساغر
وہی دریا، وہی چوب کلیمی   اسی سے قلب دریا کی دونیمی
ہرن ہے مرغزار آسماں کا   پیے پانی تو جوئے کہکشاں کا
قیام اس کا زمین و آسماں میں   الگ چلتا ہے رہ کر کارواں میں
ہے گرد اس کے جہان ظلمت و نور   صدا کیا؟ صور و مرگ و جنت و حور
نمود آدم و ابلیس اسی سے   کشود آدم و ابلیس اسی سے
نظر ٹھہرے گی کیا اس پر کسی کی   کہ ہے یزداں فریب اس کی تجلی
اگر اک آنکھ سے خلوت کو دیکھے   نظر جلوت پہ ڈالے دوسری سے
گنہ ہوگا اگر اک آنکھ ہو بند   کہ شرط راہ کی دونوں ہیں پابند
وہ جو رہ کر بھی دریا آفریں ہے   بنے گوہر تو سمجھو تہ نشیں ہے
اسی دم دوسری صورت بنائے   بنے غوّاص پھر اپنے کو پائے

جو ہنگامے ہیں اس میں سب ہیں خاموش
صدا و رنگ بھی بے دیدہ و گوش

ہے اس میں ہر زمانے کا نظارا مگر ہوتا ہے کم کم آشکارا

حیات اس کی کمند قید ہو جائے تو ہر ہستی بلندی صید ہو جائے
اسی سے خود کو خود میں قید کر لے گلوئے ما سوا کو صید کر لے
دو عالم اک دن اس کے صید ہوں گے کمند ضوفشاں میں قید ہوں گے
اگر ان دو جہاں میں راہ پائے مرے دنیا اجل تجھ کو نہ آئے
نہ چل راہ طلب میں سست ہو کر خودی پر کر تسلط چست ہو کر
اگر ہے زیر، خود بیں بن، زبر ہو خدا جو! آپ سے نزدیک تر ہو
جو تو ہو نفس کی تسخیر میں طاق تو ہو جائے مسخر سارا آفاق

خوشا وہ دن جہاں ہو تیرے بس میں جہاں کیا آسماں ہو تیرے بس میں
مہ کامل سے تو سجدہ کرائے (۱) دھوئیں کی موج بن کر اس پہ چھائے
رہائی رسم بتخانہ (۲) سے پائے بتوں(۳) کو اپنی مرضی پر چلائے
تری مٹھی میں ہو جو چار سو ہو صدا ہو، نور ہو یا رنگ و بو ہو
کمی بیشی پہ تیری دسترس ہو دگرگوں ہو تو اس پر تیرا بس ہو
غم و راحت سے رشتا توڑ دینا طلسم اس کے فلک کا توڑ دینا
اترنا اس کے دل میں مثل پیکاں نہ لینا دیکھے گوہر(۴) خاک(۵) دوراں
نشان خسروی ایسے کہیں ہیں؟ یہیں شیر و شکر دنیا و دیں ہیں!

سوال (۲)

کہو! ہے علم کس دریا کا ساحل؟ ہوا کیا اس میں غوّاصی سے حاصل؟

جواب

وہ دریا زندگی ہے جس کا دھارا کمال ہوش ہے جس کا کنارا
وہ بحر موج زن، دریائے یکتا سر ساحل ہیں لاکھوں کوہ و صحرا

---

(۱) علامہ اقبال کی یہ پیشگوئی پوری ہو چکی ہے۔

(۲)، (۳) ان الفاظ کا صرف علامتی ہے، مراد جہان اور اہل جہان۔

(۴)، (۵) یہاں گندم و شیر کے لفظی ترجمہ کی جگہ گوہر و خاک کا استعمال مقصدیت کے پیش نظر کیا گیا ہے۔

ہر اک موج اس کی ہے بیتاب و خود سر   نکل آئی ہے ساحل سے اچھل کر
کئے سیراب پھر صحرا کے صحرا   سرور کیف وکم نظروں کو بخشا
اب اس کے سامنے جو شے بھی آئے   اسی کے فیض آگاہی سے چمکے
وہ خلوت گیر جلوت سے ہے نالاں   مگر ہر شے اسی سے ہے فروزاں
ضیا سے کرتی ہے پہلے تو خو رسند   پھر اک آئین کا کرتی ہے پابند
جہاں سے قربت اس کو عقل نے دی   جہاں نے دی خبر خود آگہی کی
نقاب اس کا خرد ہی نے اٹھایا   لب گویا نے عریاں تر بنایا!
سمائے کیا بدنیائے مکافات   کہ اس کے اور ہیں صدہا مقامات

جدا ہیں ہم سے کب دنیا کے مخزن   یہ دشت و در، سمندر، کوہ ومعدن
جہاں کو رنگ وبو حاصل ہے ہم سے   جدا ہو کر بھی یہ واصل ہے ہم سے
خودی نے کس لیا سارے جہاں کو   مہ و مہر و زمین و آسماں کو
تعلق سر بسر باہمد گر ہے   کہ ہر موجود ممنون نظر ہے!!
نہ سمجھے جو اسے وہ خوار ہو جائے   اگر سمجھے یم وکہسار ہو جائے
جہاں خوش دل ہماری دید سے ہے   خوشی اس کی ہماری عید سے ہے
حدیث ناظر و منظور ہے راز   دل ہر ذرہ سے آتی ہے آواز

ق

” تو اے شاہد مجھے مشہود کردے   بہ فیض یک نظر موجود کردے“
کمال ذات ہے موجود ہونا   کسی شاہد کا بھی مشہود ہونا
سمجھ کر جو نظر ہم پر نہ ڈالے   نہ ہو روشن ہماری، آگہی سے
زمانے میں ہماری ہی ضیا ہے   نہوں ہم تو صدا و نور کیا ہے
اسی سے تو بھی آداب طلب سیکھ   اسی کے پیچ و خم سے کچھ ادب سیکھ
یہ وہ رستہ ہے جس میں شیر چیتے   طلب کرتے ہیں نصرت چیونٹی سے

ذرا اپنی خودی سے آشنا ہو   تو جبریل امیں ہے پرکشا ہو
بچشم ہوش کثرت پر نظر ڈال   نمایاں ہوں گے وحدت کے خط وخال
جو ہے آگاہ بوئے پیرہن تو   لیا کنعاں میں پھر کنعاں کی خوشبو
خودی صیاد، مہرومہ ہیں نخچیر   کہ دام مہرومہ ہے اس کی تدبیر
جہاں میں بن کے آتش کار شبخوں   مکان ولا مکاں پر مار شبخوں

سوال (۳)

وصال ممکن و واجب بہم ہے؟
کہاں تک قرب وبعد وبیش کم ہے؟

جواب

جہاں کے اصل میں ہیں تین پہلو
خرد نے کردیا ہے جن کو یکرو
حد اقلیدس و طوسی یہی ہے
خرد کے واسطے کافی یہی ہے
زماں ہوں یا مکاں اس کے ہیں فرضی
زمین وآسماں اس کے ہیں فرضی
مری یہ بات ہے آماج(۱) تجھ کو
یہی ہے نکتۂ معراج تجھ کو
کہاں مطلق یہ دنیائے مکافات!
کہ ہے کوئی تو وہ نورالسمٰوات
حقیقت لازوال و لامکاں ہے
غلط ہے یہ کہ عالم بے کراں ہے
حد اس کی ہے تو بس اندر ہی اندر
کمی بیشی نہیں ہے حد سے باہر
بلند و پست سے خالی ہے اندر
اگر وسعت پذیری ہے تو باہر
ابد ہے عقل وسعت بیں کا عالم
اسے واحد ہزاروں سے نہیں کم
اگر خود عقل جویائے سکوں ہے
تو ظاہر بیں ہے، عاجز ہے، زبوں ہے
حقیقت ہم نے خود صد پارہ کی ہے
تمیز ثابت و سیارہ کی ہے
مکاں سمجھا خرد نے لامکاں کو
لپیٹا گرد و پیش اپنے زماں کو
زماں کو ہم نے سمجھا دور از حال
کئے پیدا شب و روز ومہ و سال
نہ لے تو سال ومہ کو خاک کے مول
حدیث کم بشتم کی گرہ کھول
تو خود رس بن، نہ بن ہنگامہ پرور
ذرا دیکھ اپنے باطن میں اتر کر

زباں پر ہو تو ہو فرق تن وجاں
ہے ناجائز سمجھنا اس کو ریحاں
نہاں ہیں جان میں اسرار ہستی
بدن اک ظاہری حالت ہے اس کی
عروس معنوی نے گھر سجایا
تو رخت ظاہری صورت کو بخشا
حقیقت پردہ دار زندگی ہے
مگر صورت کی لذت کش رہی ہے
جدا یورپ نے جان و تن کو سمجھا
تو دین و ملک میں بھی فرق ڈالا
کلیسا نے پڑھی پطرس کی تسبیح
امور سلطنت کی کی نہ توضیح
حکومت میں بھی مکر و فن یہی ہے
تن بے جان و جان بے تن یہی ہے

---

(۱) نشانہ (Target)

مگر تو عقل و دل کو ہمسفر کر
ذرا ترکی کی ملت پر نظر کر
بہ تقلید فرنگ اتری زمیں میں
نہ سمجھا ربط اس نے ملک و دیں میں

'اکائی' ہم نے یوں صد پارہ دیکھی
تو گنتی کو بنا ڈالی عدد کی
ذرا سی ہے یہ سب دنیائے فانی
اُسی اک ذات اقدس کی کہانی
خرد ہے مُردوں کی صورت نگاری
ید موسیٰ نہ اعجاز مسیحی
جب اس حکمت کو میں نے ہیچ پایا
سراسر دوسری حکمت کو ڈھونڈا
تغیر میں ہے دنیا میرے نزدیک
کہ دل زندہ ہے اس کا میرے نزدیک
تو شغل خود شماری سے گذر جا
خودی کو دیکھ پھر ہو جادہ پیما
جہاں خود جزو ہی کل سے فزوں ہے
قیاس رازی و طوسی جنوں ہے
ارسطو کی کبھی حکمت پرکھ لے
کبھی بیکن کی بھی تو بات رکھ لے
مگر ان کے منازل سے گذر کر
نہ رک ہرگز کہیں، آگے سفر کر
خرد جو جانتی ہے بیش و کم کو
جو خود پہچانتی ہے کان و یم کو
زمانے کو بنا زیر فرا میں
فلک پر روک راہ ماہ و پروین
مگر اس کے لئے حکمت نئی سیکھ
پرانی روز و شب کی ہو گئی لیکھ
تری دنیا ہے اس منزل سے آگے
وہی ہے راست رو جو چپ نہ ڈھونڈے

سوال (۴)

قدیم و محدث آخر ہٹ گیا کیوں؟
کہ یہ عالم بنا وہ ذات بے چوں

جواب

خودی کی زندگی کا اور ہے طور
فراق عارف و معروف ہے اور
قدیم و محدث اک اپنی ہے گنتی
یہ گنتی ہے حقیقت میں طلسمی
ہمیں نے دوش و فردا کا بُنا جال
بنائے ماضی و مستقبل و حال
ہے مرکز سے جدائی فطرت اپنی
تپش اور نارسائی فطرت اپنی
بغیر اس کے نہیں کچھ وزن اپنا
نہ ہجر اس کو ہمارا ہے گوارا
اسے ہم سے نہ ہم کو فصل اس سے
جدائی میں ہے اپنا وصل اس سے
نظر مٹی کو دیتی ہے جدائی
پہاڑ اس سے ہی بن جاتی ہے رائی
فراق آئینہ دار عاشقی ہے
جدائی سازگار عاشقی ہے

اگر ہم زندہ ہیں تو درد دل سے
تعلق ہے یہ اسرار الٰہی
اسی سے ہر طرف تابندگی ہے
محبت دیدہ ور ہے انجمن سے
تجلّی دل شیدا وہی ہے
درودیوار و شہر و کاخ و کو، کیا !
کبھی رہتا ہے وہ بیگانہ ہم سے
کبھی ہم اور اس کی بت تراشی
کبھی ہر پردۂ فطرت اٹھایا
یہ کیا دیوانگی ہے اپنے سر میں
عجب سودا ہے جو آزار بھی ہے !
ضیا کی ہجر نے پیدا نظر میں
خودی کو امتحان کا سوز بخشا
لئے دامن میں چشم تر کے موتی
خودی کو اپنے سینے سے لگانا

اگر پائندہ ہیں تو درد دل سے
دوام ذات پر اپنے گواہی
حضور بزم راز زندگی ہے
محبت خود نگر ہے انجمن سے
جہاں ناپید ہے پیدا وہی ہے
سوا اس کے ہمارے کیا ہے دنیا؟
کبھی لیتا ہے کارِ خانہ ہم سے
کبھی ہے غائبانہ سجدہ پاشی
جمال یار بے باکانہ دیکھا
ہے جس سے روشنی قلب و نظر میں
فروغ دیدۂ بیدار بھی ہے !!
تو اس نے شام کو ڈھالا سحر میں
غم دیرینہ عیش نو سے بدلا
حلاوت اس کو نخل غم نے بخشی
فنا کو ہے بقا پایہ بنانا

محبت کیا ہے جز قبض مقامات ؟
محبت کو نہیں ہے ذوق انجام
خرد اس کے لئے بند قفس ہے
ہماری راہ میں لاکھوں جہاں ہیں
حیات و موت کی حد سے گذر کر
نہیں گم گشتگی انجام اپنا
خودی بند مقابل سے بری ہے

محبت کیا ہے ؟ انکار نہایات
سحر ہے یہ نہیں جس کی کوئی شام
جہاں اس کا فروغ یک نفس ہے
مگر اپنے قدم رکتے کہاں ہیں
جو عالم پیش آئے اس کو سر کر
آسے بس میں ہے کرنا کام اپنا
خودی اپنی جگہ رہ کر خودی ہے

سوال (۵)

”نفی ما و او“ سے کیا ہے مطلب؟

خودی کی جستجو سے کیا ہے مطلب؟

جواب

خودی تعویذ حفظ دو جہاں ہے

اسی کی ضو بقائے این و آں ہے

بقا کرتی ہے اپنی رونمائی
تو کثرت بنتی ہے اس کی اکائی
کشود اس کی ہماری رونمائی
نمود اپنی ہے اس کی پرکشائی
ضمیر اس کا ہے بے پایاں سمندر
جو قطرے میں ہے پنہاں موج بن کر
اسے رہتی ہے ہردم بیقراری
پئے جلوہ ضرورت ہے ہماری
حیات آتش، خودی اس کا شرر ہے
وہ ثابت رہ کے سر گرم سفر ہے
وہ اندر رہ کے باہر دیکھتی ہے
یہی تفسیر اعجاز خودی ہے
خودی ہے اپنے اندر پیچ در پیچ
کشائش اس کی ہے یہ ذرۂ ہیچ (۱)
نہاں ہوکر وہ صرف ہا و ہو ہے
اسے بھی رنگ و بو کی جستجو ہے
تگاپو میں ہے یوں سوز دروں سے
جنوں کی جنگ ہو جیسے جنوں سے
نظام دہر ہے یہ جنگجوئی
ہے جہد للبقا آئینہ روئی
تراوش ہے خودی کی اس کا پرتو
جواہر خیز ہے اس کی تگ و دو
خودی کا پیکر خاکی ہے پردہ
طلوع اس کا ہے جیسے مہر تازہ
ہمارا دل ہے اس سورج کا خاور
ہماری خاک میں ہے اس کا جوہر
تو کہتا ہے کہ ہے تفسیر من کیا ؟
سفر ہے درمیان جان و تن کیا ؟
بتایا ربط میں نے جان و تن کا
خودی کو دیکھ 'من' کو دیکھلےگا
بیکدم اور نظارہ ابد کا !
اندھیرے میں تجھے آئے نظر کیا !!
یہ ہر بیم و رجا سے ہے کنارہ
عصا سے نیل کو کرنا دو پارہ
طلسم بحر و بر کو توڑدینا
دکھانا معجزہ شق القمر کا
پھر ایسے لامکاں سے لوٹ آنا
کہ دل میں 'وہ' ہو مٹھی میں زمانا
مگر یہ راز کھولے گا کوئی کیا
کہ شیشے کو خذف ریزہ کہے گا
کروں کیا میں صفات 'من' کی تشریح
کہ ہے انّا عرضنا(۲) اس کی توضیح
فلک لرزاں ہے اس کے کرّ و فر سے
زماں ہو یا مکاں سب اس کے بندے
دل آدم میں اس کی روشنی ہے
یہ قسمت ایک مشت خاک کی ہے
جدا ہوکر بھی ہے پیوستۂ غیر
خودی میں گم ہے اور پابستۂ غیر
وہ مشت خاک میں کیونکر نہاں ہے
جو پرّاں بے مکاں و بے زماں ہے
مقید ہو کے آزاد ! اللہ اللہ !!
کمند و صید و صیاد ! اللہ اللہ !!

---

(۱) مراد "انسان"

(۲) قول باری تعم ان عرضنا الامانته علی الارض الخ کی طرف اشارہ ہے جس میں عظمت انسانی کا ذکر ہے۔

ترے سینے میں جو روشن ہوا ہے   بتا تو ہی کہ یہ کیسا دیا ہے؟
نہ ہو غافل کہ تو اس کا امیں ہے!   نظر کر دل پہ وہ دل میں مکیں ہے!!

سوال (٦)

وہ کیا ہے جزو جو کل سے سوا ہے؟   طریقہ جستجو کا اس کی کیا ہے؟

جواب

خودی اپنے قیاسوں سے ورا ہے   فزوں اس کل سے جو تو دیکھتا ہے
فلک سے روز کرتی ہے کہ ابھرے   یہ خود آموز کرتی ہے کہ ابھرے
یہاں اس کے سوا ہے خود نگر کون؟   کہ بے پر بھی ہے یوں پرواز گر کون؟
اسے حاصل ہے وہ شیریں کلامی   کہ چن لاتی ہے قعر دل سے موتی
ضمیر زندگی ہے جاودانی!   بہ ظاہر دیکھنے تو ہے زمانی!!
مقدر اس کا ہے تقویم ہستی   وہ زندہ بھی ہے، حفظ زندگی بھی
وہ ہے ہر رنگ میں، کس میں نہیں ہے؟   کہ تقدیر اس کے سینے میں مکیں ہے!
کہوں کیا جلوت و خلوت کے اسرار   ادھر مجبور، ادھر بالذات مختار
یہی ہے بدر کے سلطان (۱) کا فرمان   کہ جبر و قدر کا اوسط ہے ایمان
تو کہتا ہے کہ ہے مخلوق مجبور   اسیر بندش نزدیکی و دور
مگر مظہر ہے یہ جاں آفریں کا   جو کثرت میں بھی ہے وحدت سراپا
ادھر بھی جبر کا امکاں کیا ہے؟   نہ ہو آزاد تو پھر جاں کیا ہے!
یہی ہے فتح کیف و کم کا حاصل   کہ جبر و قدر ہیں منزل بہ منزل

* * *

بری ہو جبر سے دامن جو اس کا   تو اس کے پاؤں کے نیچے ہے دنیا
اجارہ ہو اسے دور فلک پر   وہی قادر ہو تاروں کی چمک پر
اٹھائے گا وہ جب باطن سے پردہ   کرے گا اپنے جوہر کا نظارہ
کھڑے ہیں صف بصف سارے فرشتے   کہ شاید وہ کبھی بے پردہ گذرے
بنا ہے ہر ملک میخوار اس کا   اسی کی خاک ہے معیار اس کا

* * *

نہیں کچھ راز اس کی جستجو میں   وہ ملتا ہے مقام ہا و ہو میں

---

(۱) رسول خدا ص

شب و روز اپنے ٹکرادے ابد سے   فغان صبحگاہی کو خرد سے
متاع حس ہے سرمایہ خرد کا   فغاں کی، عشق سے قائم ہے دنیا
خرد میں جز، فغاں میں کل نہاں ہے   خرد فانی فغاں ہی جاوداں ہے
خرد میں ظرف کب بہر ابد ہے؟   شمار ہر نفس ہی اس کی حد ہے !
شب و روز و سحر دنیا ہے اس کی   نہیں شعلہ، شرر دنیا ہے اس کی
فغاں ہے منتہا راہ ابد کا   ہے اس کے ہر نفس میں ایک دنیا

خودی ہوتی ہے ظاہر تابہ امکاں   دکھاتی ہے نظر کو محفل جاں
ہے تو مصداق قول لن ترانی (۱)   سمجھتا ہے اسے آنی و فانی
ہمیں اندیشۂ رد و بدل کیا !   خودی جب پختہ ہے خوف اجل کیا ! !
خودی کی موت سے دل کانپتا ہے   مرا احساس کامل کانپتا ہے
ادائے عشق سے منہ موڑلینا   نشان اوج پستی کو نہ دینا
کفن اپنے لئے خود پارہ کرنا   خود اپنی موت کا نظارہ کرنا
یہ بیٹھی ہے لگائے گھات تیری   اسی سے ڈر، یہی ہے موت اپنی
بنے گا تیرا گورستاں تجھی میں !   نکیرین اس کے ہیں پنہاں تجھی میں ! !

سوال (۷)

مسافر کیا الگ ہے راہرو سے ؟   مجھے تو مرد کامل کی خبر دے !

جواب

جو دیکھے غور سے تو جانب دل   نظر آئے گی تجھ کو اپنی منزل
حضر میں جادہ پیمائی بھی ہے   سفر میں رہ کے یکجائی بھی ہے
کوئی کیونکر بتائے ہم کہاں ہیں   کہ چشم ماہ و انجم سے نہاں ہیں
نہ ڈھونڈو حد کہ اپنی حد نہیں ہے   ملی جب حد تو گم جان حزیں ہے
نہیں ہے پختگی، ہم میں ہے خامی   تمامی بھی ہے اپنی ناتمامی
یہی نا پختگی ہے زندگانی   سفر ہی ہے حیات جاودانی
ہے زیر پا، زمیں ہو، آسماں ہو   ہے گرد رہ زماں ہو یا مکاں ہو

---

(۱) حضرت موسیٰ سے تخاطب خداوندی کی طرف اشارہ ہے۔

تڑپتے ہیں کہ ہوں کیسے نمایاں
کہ ہم ہیں ایک موج بحر امکاں
خودی کی جستجو دل کے قریں رکھ
گماں سے ہٹ، نظر سوئے یقیں رکھ
تب و تاب محبت کو فنا کیا !
یقین و دید کی بھی انتہا کیا !
کمال زیست ہے نظارۂ ذات
جہت کی زد سے باہر ہوں تو ہے بات
تو ذات حق میں ایسا جاگزیں ہو
کہ دیدار بہم عین الیقیں ہو
بفیض ”من یرانی“ نور بن جا
پلک جھپکی تو خود تو بھی نہ ہوگا
بجائے خود ہو محکم پھر اسے پا
تو خود کھو جائے اتنا پاس مت جا
نصیب ذرہ کر ایسی تب و تاب
کہ بزم مہر میں چمکے بصد آب
حریم ناز میں یوں ہو فروزاں
کہ وہ پنہاں رہے تو ہو نمایاں
جو یہ سمجھیں امام دو جہاں ہیں
وہی پختہ ہے ہم نا پختہ جاں ہیں

اگر اس کو نہ پائے ڈھونڈ کر لا
اگر پا جائے دامن سے لپٹ جا
فقیہ و شیخ سے ہو دست بردار
نہ پھنسنا ان کے پھندے میں خبردار
وہ تنہا ملک و دیں کا راہبر ہے
کہ ہم ہیں کور، وہ صاحب نظر ہے
وہی ہے صبح کا مہر زر افشاں
کہ اس کا ہر بن مو ہے فروزاں
فرنگ آئین جمہوری پہ ہے شاد
کیا ہو جیسے کوئی دیو آزاد
نوا اس کی نہیں بے زخمہ و ساز !
کہ بے طیارہ کب ہے اس کی پرواز
چمن سے اس کے بہتر کشت ویراں
تو اس کے شہر سے بہتر بیاباں
لٹیرا کارواں کا ہے
اسے اب ایک روٹی اک جہاں ہے
ہے اس کی روح مردہ، تن ہے بیدار
ہنر اور دین و دانش سب ہوئے خوار
خرد بھی کفر ہے اور کفر آموز
فن افرنگ ہے انسانیت سوز
جماعت باجماعت دشمنی ہے
خدا حافظ اگر حالت یہی ہے
یہ پیغام اہل مغرب کو سنا دے
کھلی شمشیر ہیں جمہور تیرے
یہ شمشیر دو پیکر ہے عجب چیز
اسے کیا مسلم و کافر کی تمیز
ٹھہرتی ہی نہیں دم بھر میاں میں
ہمیں مارے، مرے خود بھی جہاں میں

سوال (۸)

زباں کس راز حق کی ہے انا الحق؟
خلاف عقل تھا وہ رمز مطلق ؟

جواب

میں پھر رمز انا الحق کہہ رہا ہوں
مخاطب ہند و ایران سے ہوا ہوں
کسی ساقی نے یہ فقرہ کہا تھا
خودی کا زیست کو دھوکا ہوا تھا!
کہا اس نے ”خدا جب سو گیا ہے
ہماری ذات میں ظاہر ہوا ہے
ہیں اب سب تحت وفوق وجستجو خواب
سکون، رفتار، شوق و جستجو خواب
دل بیدار و عقل نکتہ بیں بھی
گمان و فکر و تصدیق و یقیں بھی
ہے خوابیدہ تری یہ چشم بیدار
تری گفتار اور تیرا یہ کردار!
جو وہ جاگا، کبھو، جاگے گا پھر کون؟
متاع شوق کو بیچے گا پھر کون؟“

ہماری عقل کی ضو ہے قیاسی
قیاسی چیز ہوتی ہے حواسی
جو حس بدلے تو یہ عالم بدل جائے
سکون، رفتار کیف وکم بدل جائے
ہے رد ممکن جہان رنگ و بو کا
زمین و آسمان یا کاخ وکو کا
یہ کہہ سکتے ہیں ”سب خواب وفسوں ہے
حجاب روئے ذات بے چگوں ہے
یہ ساری ہوش کی نیرنگیاں ہیں
یہ چشم و گوش کی نیرنگیاں ہیں“
خودی ہے اور، بزم رنگ و بو اور
بجائے حس ہے ربط ماو او اور
نظر میں کیوں رہے محفل خودی کی
کہ خود کو دیکھتے ہیں ہم تو یوں بھی
سحر اس کی نہیں دور فلک سے
ہے خود بینی بری تخمین و شک سے

کبھی جو تو کہ ”من، وہم و گماں ہے
نمود اس کی نمود این و آں ہے“
بتا مجھ کو ہے دارائے گماں کون؟
نظر خود پر تو کر، ہے بے نشاں کون؟
جہاں ظاہر مگر محتاج حجت!
نہیں جبریل کو بھی اس پہ قدرت!!
خودی پنہاں، دلائل سے جدا ہے!
ذرا سوچ آخر اس میں راز کیا ہے!
خودی کو حق کہو، باطل نہ سمجھو
خودی کو کشت بے حاصل نہ سمجھو
خودی پختہ ہوئی تو لایزل ہے
فراق اپنا و صال بے خلل ہے
شرر میں تیز بالی بھی ہے ممکن
تپید لایزالی بھی ہے ممکن
دوام حق نہیں اس کے عمل سے
کہ وہ خالی ہے اسباب و علل سے
دوام اپنا یہ بہتر ہے کہ ہستی
بنے محکم بہ فیض عشق و مستی
یہ سب ہیں کوہ وصحرا، دشت ودر ہیچ!
جہاں فانی، خودی باقی دگر ہیچ!!

ہے ترک شنکر و منصور بہتر   خدا کو ڈھونڈ اپنی راہ چل کر
سراپا خود ہی تحقیق خودی بن   انا الحق کہہ کے صدیق خودی بن

سوال (۹)

تہِ وحدت سے واقف کون نکلا ؟   شناسا سب تھے، عارف کون نکلا؟

جواب

تہِ گردوں بھی ہے تو دل پذیری   مگر فطرت ہے سب کی زود سیری
جو دوش شام ہر سورج کی ہے لاش   ستاروں کا کفن ہے چاند کی قاش
کبھی کہسار ہیں صحرا کی صورت   دگرگوں ہے کبھی دریا کی صورت
گلوں کی گھات میں باد خزاں ہے   متاع کارواں کیا ؟ بیم جاں ہے
ٹھہرتی ہی نہیں لالہ پہ شبنم   ٹھہرتی ہے تو اڑجاتی ہے اک دم
نوائیں ساز میں مرتی ہیں اکثر   شرر مرتے ہیں کچھ پتھر میں رہ کر
اجل کا ہاتھ ہے ایسا جہانگیر   ہمارا ہر نفس ہے اس کی زنجیر !

غزل

فنا صہبائے ہر ساغر بنی ہے !   صلائے عام یہ کافر بنی ہے !!
تماشا گاہ مرگِ ناگہاں کا   جہان ماہ و انجم نام ٹھہرا
کوئی ذرہ سفر کی راہ ڈھونڈے   تو اس کو باندھ لیں تار نظر سے
قرار جان و دل سے کیا ہمیں کام   کہ ہم سب ہیں اسیر دور ایام
خودی کو دل میں تا انجام ٹھہرا   کہ یہ کوکب چراغ شام ٹھہرا

جہان یکسر مقام آفلیں(۱) ہے   یہی دنیا میں عرفان مبیں(۲) ہے
ہماری رہ، وہ باطل نہیں ہے   ہمارا رنج بے حاصل نہیں ہے
حفاظت کرتے ہیں ہم آرزو کی   سرور ذوق و شوق جستجو کی
خودی کو لایزل کرنا ہے ممکن   جدائی وصل کی بنتی ہے ضامن
نفس سے شمع ہوجاتی ہے روشن   شگاف چرخ کو کافی ہے سوزن

---

(۱) غروب ہونے والے ۔
(۲) حضرت ابراہیم کے عرفان حقیقت کی طرف اشارہ ہے ۔

خدائے زندہ کو ذوق سخن ہے!   تجلی اس کی کیا بے انجمن ہے؟
یہ کس نے برق جلوہ دل پہ لی ہے؟   شراب معرفت یوں کس نے پی ہے؟
عیار حسن و خوبی کس کا ہے دل؟   مدار طوف مہ ہے کس کی منزل؟
'الست'(۱) آخر تھا کس کا نغمہ ناز؟   'بلیٰ'(۲) میں تھی وہ کس کے دل کی آواز؟
عطائے عشق تھی اپنی وہ آواز!   جلائے جس نے لاکھوں پردۂ راز!!
ہمیں سے دور میں ہے جام ساقی!   ہمیں سے گرمئی ہنگامہ باقی!!
میں تنہائی سے اس کی مر رہا ہوں   بہم سامان محفل کر رہا ہوں
مثال دانہ بوتا ہوں خودی کو   نہ خود کو اور نہ کھوتا ہوں خودی کو

خاتمہ

تو ہے تلوار اٹھادے پردہ اپنا   نکل آ میان سے باہر نکل آ!
حجاب ممکنات اپنا اٹھادے   نجوم و مہر و مہ آغوش میں لے
منوّر شب کو کر نور یقیں سے   ید بیضا نکال اب آستیں سے
اٹھی دل کی طرف جب چشم خودبیں   شرر ہو کر بھی کاٹی فصل پرویں
مرے دل کا شرر ہے تجھ کو موزوں   کہ میں بھی مثل(۳) رومی گرم خوں ہوں
نہیں تو آتش تہذیب نو لے   سجا لے تن کو، دل کو مردہ کردے

---

(۱) قول باری تعالیٰ: الست بربکم (کیا میں تمارا اب نہیں ہوں) کی طرف اشارہ ہے۔
(۲) ارشاد خداوندی: قالو بلیٰ کی طرف اشارہ ہے۔
(۳) مولانا جلال الدین رومیؒ۔